انبیائے کرامؑ کا طریقۂ خطاب

مولانا امین احسن اصلاحی

انبیائے کرامؑ کی بعثت ہوتی ہی اس زمانے میں ہے، جب کہ حق و باطل میں امتیاز، وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہوجاتا ہے اور عملاً تمام نظامِ زندگی، حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آچکتا ہے۔ ایسے زمانے میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس کے دائرے سے باہر حق کے کچھ اجزا تو پائے جاسکتے ہیں، لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرامؑ ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ ''اے کافرو! ایمان لاؤ، اے مشرکو! توحید اختیار کرو''، تو صورتِ واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بے جا نہیں ہوسکتا، کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر وشرک ہی ہے۔

جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرامؑ کی تاریخ پڑھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو ''اے انسانو! اے لوگو! اے میری قوم! اے اہل کتاب! اے وہ لوگو! جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو! جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے'' وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اس قدر مایوس نہ کردے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔

جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہل حق کا وجود اپنے اندر کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور تائیدِ حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کی ضد کے آگے بیکار ہوکے رہ جاتی ہے۔ اس وقت انبیائے کرامؑ اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے کافر ومشرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو اپنے کفر وشرک پر اڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُسوہ

یوں تو یہ حقیقت ہر نبیؑ کی دعوت میں واضح ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی، وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو، جن الفاظ سے خطاب کیا ہے، ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں۔ لیکن جب دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے دَرپے ہوگئی۔ اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ایسے الفاظ میں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے کفر و شرک کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد تک ہوسکتی تھی وہ اب ختم ہوچکی ہے، اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں بلکہ قوم کے ساتھ اس وقت تک کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں، جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ ۶۰:۴) تمھارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں ہے، جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بَری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہوگئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ (لاشریک لہٗ) پر ایمان لاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قربِ ہجرت سے پہلے کی کسی

سورۃ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپؐ نے اپنی قوم کو یا اہلِ کتاب کو صریح طور پر کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو یٰٓاَیُّہَا الْاِنْسَانُ کے الفاظ سے یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ یا، یٰقَوْمِ کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہل کتاب کے لیے یٰٓاَہْلَ الْکِتٰبِ کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو 'اے منافقو' کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔

لیکن جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرلیا۔ اس وقت آپؐ نے ہجرت فرمائی اور کفّارِ قریش کو صاف صاف 'اے کافرو' کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ اسی ہجرت کے موقعے پر یہ سورۃ نازل ہوئی جو قریش سے اعلانِ برأت بلکہ اعلانِ جنگ کی سورۃ ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝۶ (الکافرون ۱۰۹:۱-۶) کہہ دو: اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا۔ اور نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں پوجتا آرہا ہوں۔ تمھیں تمھارا دین اور مجھے میرا دین۔

کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق

انبیائے کرام علیہم السلام یہ ساری احتیاط صرف اس حد تک برتتے ہیں۔ جہاں تک لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینے کا معاملہ ہے، ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرامؑ کبھی کوئی رعایت نہیں فرماتے۔ اس چیز میں اگر کسی وجہ سے وہ کوئی رعایت کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور سخت سے سخت مخالف حالات

کے اندر بھی ان کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی بات کو کفر وشرک قرار دینے میں نہ وہ کسی خطرے کی پروا کریں اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کریں۔ اس کا سبب العیاذ باللہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر ومشرک قرار دینا چاہتے ہیں۔ لیکن محض فتنے کے اندیشے یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے، ایسا کرنے سے احتراز کریں۔

اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفّار جس طرح کے سمجھوتے کی تجویز پیش کیا کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کر کے سارا جھگڑا ختم کر سکتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ کسی پیغمبر علیہ السلام نے بھی دین کے بارے میں کبھی اس طرح کی مصلحت کا لحاظ نہیں کیا، خواہ اس کی وجہ سے اس کو کتنے ہی بڑے بڑے خطرات کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ اس وجہ سے یہ سوال قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر وشرک کو کفر وشرک قرار دینے کے معاملے میں جو لوگ اتنے بے پروا اور اتنے بے خوف تھے، انھوں نے کفر وشرک کے مرتکبین کو کافر ومشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے برأت اور علیحدگی کے اعلان میں اتنی دیر لگائی؟

اس فرق کی دو وجہیں

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام، کفر وشرک کو کفر وشرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کفر وشرک قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت میں جو دیر لگاتے ہیں، اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں:

● **پہلی وجہ:** پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش و ملامت ہے، وہ اتمامِ حجت اور تبلیغِ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہارِ بیزاری جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ انبیائے علیہم السلام کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرامؑ لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقعہ دیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوجائے۔ اور ان کے انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدت کی تبلیغ وتعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاؑ کے وقفہ کے زمانے میں جو تاریکی چھا جایا کرتی ہے، وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سُجھائی نہیں دیتی، چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ تعلیم وتبلیغ کا محتاج ہوجاتا ہے۔

چونکہ تمام گمراہیاں باپ دادا کی روایات بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں، اور ان کے ساتھ کچھ لوگوں کے اغراض بھی وابستہ ہوجاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔ حضرات انبیائے کرامؑ پورے صبر واستقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس جہاد میں سرگرم رہتے یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہوجاتا کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے تھے، کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ جب تبلیغ کا حق اس حد تک پورا ہوچکتا، تب انبیاؑ کے لیے یہ بات جائز ہوتی کہ وہ منکرین کے کفروشرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہوجائیں۔

● **دوسری وجہ:** دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام حق کی جگہ باطل کی بنیاد ہی پر قائم ہوکر چلنے لگ جاتا ہے تو اُن لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہوجاتی ہے، جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشے میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے۔ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیائے کرامؑ لوگوں پر کفروشرک کے فتوے جڑ کر ان سے براءت کا اعلان کردیتے تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوتا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلانِ براءت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہل حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی، جس پر حق پرست چل سکتے ہوں، اگرچہ یہ [راہ] ابھی تنگ اور دشوار گزار ہی ہو۔ تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمایشوں کی خاطر باطل کی راہ پر بھاگے چلے جارہے ہیں، ان کے کفر کا بھی اعلان کردیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کرلی جائے۔

موجودہ حالات میں طریقۂ کار

حضرات انبیائے کرامؑ کے اس اسوۂ حسنہ سے اگر ہم موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس پوری دُنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاؑ کے وقفہ کے زمانے سے اشبہ [اِشْبَاہ / مانند] ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج

بے کم و کاست ہمارے اندر موجود ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دُنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہوگی، لیکن خلق کی رہنمائی اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام، خلافت کا نظام تھا، جو ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے۔

اس وجہ سے اس وقت دُنیا جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکی ہے اس کے لیے وہ ایک بڑی حد تک معذور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دُنیا پر اتمامِ حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں، جو ایک طرف دُنیا کو نیکی اور بھلائی کے راستہ کی دعوت دے اور دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے سے مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پوری نہیں ہو رہی ہے بلکہ عملاً ساری دُنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آچکی ہے اور باطل ایسی قوت و شوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی جگہ سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

نظامِ تعلیم، نظامِ تمدن، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے، یہاں تک کہ اس کے زیرسایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے انجام دیا بھی جا رہا ہے تو وہ بھی اس وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ نیک سے نیک انسان، جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستہ ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے حق کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ اگر دُور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیتے ہیں تو قریب والے ہی اس سے اُلجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ ''بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں، نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں''۔ یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دورویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز روسواریاں ہیں۔ حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش و آرام ہے۔ آپ جس وقت چاہیں آرام سے

منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دُور کرلیں تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر منزل تک خطرے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

ایسے نازک اور پُرآشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہوگئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہوسکتی ہے تو یہ ہوسکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سروسامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلط کے باوجود، خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد رہ گیا ہے۔ یہ بے چارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے اور سینہ سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں، نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمع ایمان زندہ رکھی ہے، اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیرشعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔